ابن العربی کا نظریۂ توحید اور بلّھے شاہ

عذرا وقار*

کسی بھی خدا پرست معاشرے میں خدا، معاشرہ اور انسان مل کر ایک تکون بناتے ہیں اور ان تینوں کے درمیان ایک باہمی نسبت موجود رہتی ہے۔ خدا کے تصور کے بارے میں دو نظریے وحدت الوجود اور وحدت الشہود مقبول ہیں۔ پہلے نظریے کے مطابق خدا کائنات کی تخلیقات میں اپنا اظہار کرتا ہے اور ہر جگہ موجود ہے۔ دوسرے نظریے کے مطابق خدا کائنات سے ماورا ہے اور ہم اُسے اُسکی نشانیوں (صفات) سے پہچانتے ہیں۔ ان دونوں نظریات کا انسان کے سماجی حالات سے گہرا تعلق ہے۔ کیونکہ ہر دوسرے علم کی طرح فلسفہ بھی انسانی ضروریات کے باطن سے جنم لیتا ہے اور سرفرازی، شکستگی اور تعصبات کے رجحانات ہر معاشرے میں موجود ہوتے ہیں۔ جب کوئی فاتح قوم کسی دوسری قوم پر غلبہ حاصل کر لیتی ہے تو محکوم قوم میں انتشار و شکستگی اور بے بسی کے احساسات پیدا ہونا لازمی ہیں۔ اس دور میں پنپنے والے فلسفوں میں وحدت الوجود کا رنگ نمایاں ہوتا ہے۔ یعنی سب لوگ اور مذاہب برابر ہیں، ہر نسل اللہ کی پیدا کردہ ہے اور وہ خود ہر وجود میں موجود ہے۔ اس لیے کوئی انسان کمتر نہیں ہے۔ اسی طرح حاکم قوم میں سرفرازی اور تعصبات کے رجحانات پرورش پاتے ہیں۔ ایسے ماحول میں وحدت الشہود کا فلسفہ مقبول ہوتا ہے جس کے مطابق حکمران اور رعایا اسی طرح ایک دوسرے سے الگ ہیں جس طرح خدا اور کائنات کا وجود ایک دوسرے سے اپنی نوعیت کے لحاظ سے مختلف ہے۔ ان دونوں نظریات کو بالترتیب نظریۂ تنزیہہ اور نظریہ تشبیہہ بھی کہا جاتا ہے اور ان کے لیے ماورائیت اور مظہریت کی اصطلاحات بھی استعمال ہوتی ہیں۔

یونانی فلسفے کے بانیوں میں ارسطو نے خدا کا ایک تصور پیش کیا جس میں اُسے ایک محرک اعلیٰ

---

* سابق سینئر ریسرچ فیلو قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت، مرکزِ فضیلت، قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد۔

اور غیر مادّی خود شناسی کہا گیا۔ تیرھویں صدی میں ابن العربی(۱۱۶۵-۱۲۴۰) نے نظریہ توحید پیش کیا۔ ایرانی فلسفی ملا صدرا[۱] (۱۵۷۱-۱۶۴۰) کا مکتب فکر وحدت الوجود سے متعلق ہے۔ یعنی وجود روح سے پہلے موجود تھا۔ اُنہوں نے ابن العربی کے نظریہ وحدت کی مخالفت کی۔ جس کا تفصیلی ذکر ہم نیچے کریں گے۔ ملا صدرا کے خیال میں حقیقت ہمیں مختلف صورتوں میں دکھائی دیتی ہے اور یہ پھیلاؤ ہمیں جوہر کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ مگر در اصل ہم پہلے اشیاء کو دیکھتے ہیں اور پھر جوہر کو اور پھر اس کے بارے میں نظریات گھڑتے ہیں۔ اُن کے فلسفے کی ایک اور جہت اُنکا نظریہ گردش ہے یعنی یہ کہ ہر شے کی ماہیت ہر وقت تبدیل ہوتی رہتی ہے اور جو ایک خود حرکتی وجود کے خول میں جذب ہوتے رہنے کا نتیجہ ہے۔ حقیقت ایک وحدت ہے جیسے کہ عشق، عاشق اور معشوق۔ ان کے درمیان ایک اکتسابی عمل جاری رہتا ہے۔ جدید مغربی فلسفیوں میں عمانوئل کانت(۱۷۲۴-۱۸۰۴) نے انسانی علم سے ماورا حقیقت کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ یعنی ازل سے جو کچھ موجود ہے اس سے پہلے کہ ہم خود اس کے ذریعے اسکا تجربہ کریں اس کے بارے میں ہمارے اندر ایک وجدان موجود ہوتا ہے۔ ولیم ہیگل(۱۷۷۰-۱۸۳۱) کے مطابق عظیم روح خود کو انسانی زندگی میں خیالات اور مظہریاتی سانچوں میں ڈھال کر سامنے آتی ہے اور عظیم روح اورانسانی دماغ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ اُس نے ماورائے ادراک حقیقت کا نظریہ پیش کیا جس کے مطابق روح فطرت میں اپنا اظہار کرتی ہے اور انسان بھی فطرت کا ایک حصہ ہے۔[۲]

ابن العربی کا نظریہ توحید

دنیا میں موجود روحانی افکار میں ابن العربی کا بہت اونچا مقام ہے۔ اُن کے خیالات جتنے گہرے اور پیچیدہ ہیں ان کی تحریریں بھی اتنی ہی گنجلک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے اولین نقادوں نے اُن کے ساتھ نظریہ وحدت الوجود کو منتھی کر دیا حالانکہ اُن کے بارے میں یہ خیال درست نہیں۔ یہاں ہم اُن کے نظریۂ توحید کو پیش کریں گے تا کہ اس غلط فہمی کا ازالہ ہو سکے۔ اُنکی فکر خدا، کائنات اور انسان کا احاطہ کرتی ہے اور اُن کے مطابق کائنات میں جو بھی حرکت ہے وہ محبت کے باعث پیدا ہوتی ہے۔ توحید کے فلسفے کو وہ یوں بیان کرتے ہیں کہ ہر شے کی ایک حقیقت ہے۔ انسان کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر شے کو اُسکا حق دے۔ تمام حقوق پر مقدم یہ حق ہے کہ خدا کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ یعنی کوئی اور وجود اصلی نہیں سوائے خدا کے۔ اسی کو وہ توحید کہتے ہیں۔[۳]

اِسی توحید کی ذمہ داری ادا کرنے کے بعد انسانی روح کو حقیقی خوشی نصیب ہوتی ہے ۔ ابن العربی کے مطابق خدا کا یہ حق تمام علم اور عمل کا راہنما اصول ہے۔ یعنی 'الحق' کے حوالے سے سچائی، اصلیتِ کائنات، روح اور انسانی معاملات کو جاننا۔ اُس عظیم سچائی کو جسے حقیقت تمام مظہرات میں ظاہر کرتی ہے روح کے امکانات میں جھانک کر، اُس کے حقوق ادا کرنے کو توحید کہا جاتا ہے۔ ابن العربی نے خالص اسلامی حوالے سے خدا کی ذات کو سمجھنے کی کوشش کی اور اسی حوالے سے وہ خدا کے ماورائے ادراک ہونے کو اس کی ایک جہت سمجھتے ہیں۔ خدا نے کئی مرحلوں میں کائنات کی تخلیق کی اور ہر موجود شے خدا کے ساتھ جڑی ہوئی ہے مگر خدا ان سے علیحدہ وجود بھی رکھتا ہے۔

ابن العربی نے اپنے نظریۂ توحید کی عمارت کو تعمیر کرنے کے لیے قرآن مجید کو اپنا ہادی بنایا اور خدا کے کلام کو خود میں جذب کرنے اور اُسے روحانی کشف کا ذریعہ بنانے کیلئے خود کو وقف کر دیا۔ اُن کے خیال میں خدا کا کلام قرآن مجید کے علاوہ کائنات اور روح میں بھی اپنا اظہار کرتا ہے۔ جیسا کہ خدا نے جب کائنات بنائی تو اُس نے کلام کیا۔ اُس نے کہا 'کُــــن' یعنی 'ہو جا' اور کائنات وجود میں آ گئی۔ چنانچہ کائنات بھی خدا کا کلام ہے۔ روح ،کائنات اور قرآن مجید تینوں میں خدا کی مشابہت موجود ہے۔ خدا نے قرآن کی آیات کو کائنات کی نشانیاں کہا ہے۔ کلام خدا کی ایک صفت ہے اور جس طرح انسان سانس کے ذریعے الفاظ تخلیق کرتا ہے۔ اسی طرح خدا کائنات کو اپنے کلام اور اپنے نفس سے تخلیق کرتا ہے۔ اُس کے نفس کے لیے 'نفس الرحمٰن' کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ یہ تخلیق اس کی رحمت سے وجود میں آتی ہے اور یہ تخلیق انبساط وجود کہلاتی ہے۔ اُس کی تخلیق وسیع ہے اس لیے قرآن مجید کو پڑھ کر جو جو مطالب بھی نکالے جاتے ہیں سب اُس کو مقصود ہوتے ہیں۔ پھر جس طرح انسان کا کلام بولنے کے بعد معدوم ہو جاتا ہے اسی طرح خدا کے علاوہ ہر شے ہر دم تبدیل ہوتی ہے۔ اور نئے سرے سے تخلیق ہوتی ہے۔ خدا کے اظہار میں تکرار نہیں ہوتی۔ یہی توحید ہے۔ انسان کی حقیقی منزل یہ ہے کہ وہ حقیقت اولیٰ کے ساتھ مکمل ہم آہنگی پیدا کرے اور اسی کے لیے قرآن کی روح اور اس کی شان کو سمجھنا ضروری ہے۔ قرآن میں خدا کو روشنی کہا گیا ہے۔ روشنی بصارت اور ادراک پیدا کرتی ہے مگر خود دکھائی نہیں دیتی۔ اسی طرح وجود مطلق مظہرات کو وجود میں لاتا ہے۔ مگر خود دکھائی نہیں دیتا نہ کہیں پایا جاتا ہے۔ یہی روشنی حقیقت ازلی کا جوہر ہے اور یہ خود رشتوں اور صفات سے علیحدہ ہے۔ جب یہ روشنی ظاہر ہوتی ہے تو 'وجود المقید' بن جاتی ہے۔ یہی

روشنی انکشافات کرتی، آگاہی دیتی اور ادراک پیدا کرتی ہے۔ اس ساری بحث کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ابن العربی وحدت الوجود کے قائل نہ تھے۔ خدا کے ماورا ہونے پر بھی یقین رکھتے تھے۔ مگر اُسے کائنات میں جاری و ساری بھی دیکھتے تھے۔ اُن کے مطابق قلب انسانی ادراک کا سرچشمہ ہے۔ جس کی دو آنکھیں ہیں۔ ایک آنکھ عقل سے دیکھتی ہے اور دوسری تخیل سے۔ پہلی آنکھ سے خدا کی کائنات میں مظہرات کی گہما گہمی دکھائی دیتی ہے اور دوسری سے ہر طرف ایک اکائی کی صورت نظر آتی ہے۔[۴]

جو انتشار ہمیں خدا کی کائنات میں دکھائی دیتا ہے اور فلسفہ وحدت الشہود کی بنیاد بنتا ہے۔ اُس کی ایک وجہ انسان اور سماج کے معاشرتی اور سیاسی حالات ہوتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم بلھے شاہ کی شاعری میں ماورائیت اور مظہریت کے فلسفوں کے اثرات تلاش کریں اور یہ دیکھیں کہ آیا ماورائیت کو مظہریت کے سانچوں میں پیش بھی کیا جاسکتا ہے یا نہیں اور کیا یہ دونوں نظریات ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ہم سترہویں اور اٹھارویں صدی کے پنجاب کی ایک مختصر جھلک دیکھیں گے۔

پنجاب: تاریخی پس منظر

بلھے شاہ(۱۶۸۰-۱۷۵۷) کا زمانہ وہ تھا جبکہ مغل حکومت زوال پذیر تھی اور سکھوں کی طاقت بڑھ رہی تھی۔ بلھے شاہ کی پنجاب کے حالات پر گہری نظر تھی۔ پنجاب میں ایک طرف تو مسلمانوں کی باہمی لڑائیاں جاری تھیں۔ پھر سکھوں، مرہٹوں اور افغانوں کے ساتھ بھی جنگیں ہو رہی تھیں۔ خصوصاً نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے پنجاب کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ اس سیاسی اکھاڑ پچھاڑ میں عوامی سوچ نے ترقی کی طرف قدم بڑھایا اور شمالی ہندوستان میں عوامی زبانیں جدید رنگ میں ظاہر ہونے لگیں۔ سندھی میں عبداللطیف بھٹائی (۱۶۸۹-۱۷۵۲)، سچل سرمست (۱۷۳۹-۱۸۲۶)، اُردو میں ولی دکنی (۱۶۳۵-۱۷۰۷)، خواجہ میر درد (۱۷۲۱-۱۷۸۵)، میرتقی میر (۱۷۲۳-۱۸۱۰)، مرزا رفیع سودا (۱۷۳۱-۱۷۸۱)، مغربی فلسفیوں میں عمانوئل کانت (۱۷۲۴-۱۸۰۴) اور ولیم ہیگل (۱۷۷۰-۱۸۳۰) کا زمانہ تھا۔ اُس وقت کی سندھی، پشتو اور پنجابی شاعری میں ایک مشترکہ رنگ دکھائی دیتا ہے جس میں لڑائی جھگڑوں سے بچنے اور ایک پُر امن بقائے باہمی کی خواہش دکھائی دیتی ہے۔ اُردو شاعری میں زیادہ تر سماجی بد حالی اور اپنی ذات کے حوالے سے نا امیدی کا اظہار ملتا ہے۔ جب بھی کسی قوم پر دوسری قوم کا غلبہ ہوتا ہے تو لا محالہ وہاں نئی فکری اور علمی رجحانات کی تشکیل ہوتی ہے۔ چنانچہ

اُسوقت کے شعراء نے پسے ہوئے عوام کی بات کی اور روایتی مذہب کے رکھوالوں کے بنائے ہوئے قوانین کو ردّ کیا۔ اسی حوالے سے اُنہوں نے ایک عالمگیر مذہب محبت کی بات کی۔بلّھے شاہ کہتے ہیں

عشق دی نویوں نویں بہار
جاں میں سبق عشق دا پڑھیا-مسجد کولوں جیوڑا ڈریا
ڈیرے جا ٹھاکر دے وڑیا- جتھے وجدے ناد ہزار

ترجمہ۔ عشق میں نئے نئے موسم بہار آتے ہیں۔
جب سے میں نے عشق کا سبق پڑھا- میرا دل مسجد میں جانے سے ڈرنے لگا ہے۔
اور ٹھاکر کے ڈیرے میں جا پہنچا ہے جہاں ہزاروں ناد بج رہے ہیں۔

بلّھے شاہ کی شاعری میں تصور توحید

بلّھے شاہ کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ دل سے نکلتی ہے اور یوں اُسکا تعلق انسان کی وارفتگی یا خود رفتگی سے جڑتا ہے۔ وہ ہر دم خود کو اپنے سے برتر ہستی کے حضور میں کھڑا محسوس کرتے ہیں۔ وہ اُس کی توانائی اورحسن سے متاثر ہوتے ہیں۔ وہ تجلیات الٰہی سے پیوست ہو کر اس میں خود کوضم کر لینے کوحصول زندگی سمجھتے ہیں یہاں تک کہ ادراک زیست کے عمل میں اپنے مادی وجود کی نفی کر دیتے ہیں۔ اُن کی دانست میں خود اس سے جنم لینے والی حسیات حقیقت کے براہ راست اظہار میں رکاوٹ بنتی ہیں یا انحراف کا باعث ہوتی ہیں۔ یوں وہ کشف اور وجدان کو اپنا رہنما بناتے ہیں اور اپنے تخیل کو نئے سانچوں میں ڈھال کر نیا روپ عطا کرتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری میں انتشار کو ہم آہنگی میں اور کثرت کو وحدت میں بدلنے پر قادر ہیں۔ ایک شاعر کا سفر داخلی خلا کی طرف سفر ہوتا ہے۔ وہ خود سے لا خود کی طرف سفر کرتا ہے۔ اُس کے تخلیقی عمل میں شعور اور کاوش کے مقابلے میں لاشعور اور اُس پر اثر انداز ہونے والے متنوع عوامل کی کارفرمائی زیادہ ہوتی ہے۔ بلّھے شاہ کا کمال یہ تھا کہ اُن کے اندر کے صوفی نے شاعر کو اور شاعر نے صوفی کوروحانی غذا فراہم کی۔ اسی لیے اُن کی شاعری کا مولانا روم کی شاعری کے ساتھ مقابلہ کیا جاتا ہے۔ وہ مذہب عشق کے قائل تھے اور اُنہوں نے مذاہب کا تقابلی مطالعہ کیا ہوا تھا۔ اُن کی شاعری میں ان خیالات کا اظہار ملتا ہے کہ مذاہب اور ذاتیں لوگوں کو کاٹتی اور علیحدہ کرتی ہیں جبکہ عشق سب کو جوڑتا ہے۔ وہ

کہتے ہیں کہ اُنکی باطنی آنکھ کھل گئی ہے۔ اندر کے تمام شکوک دور ہو گئے ہیں اور ان پر خود شناسی کی منزل وا ہو گئی ہے۔ کیونکہ ان کو اپنے اندر خدا کا سراغ مل گیا ہے اور معلوم ہو گیا ہے کہ خالق و مخلوق ایک ہیں اور روح کا خدا سے ازلی تعلق ہے۔ جبکہ روح کا کوئی مذہب نہیں ہوتا یہ تفریق زمان و مکاں کی پیدا کردہ ہوتی ہے اور روح پر زمان و مکاں کی قید نہیں ہوتی۔ اُسکا نہ کوئی اول ہے نہ آخر اور نہ اُسکی حدود ہیں۔ یہ مصنوعی حدیں زبان، اصطلاحات، علم، درجہ بندیوں اوراشیاء کے ناموں کے باعث ہیں۔ یہ سب مظاہر کی حدود کو قید کر کے ان کے معنی کو محدود کر دیتے ہیں۔بلّھے شاہ زندگی میں در آنے والی دوری کو ختم کرنے کی بات کرتے ہیں۔ صوفی مت میں یہ ایک امتیازی منزل ہے جس میں خود کو ایک علیحدہ وجود کے طور پر محسوس ہونا ختم ہو جاتا ہے۔ بلّھے شاہ کی شاعری کو پڑھ کر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ وحدت الشہود اور وحدت الوجود دونوں نظریوں کے قائل تھے۔ دوسرے لفظوں میں وہ دونوں میں کوئی فرق نہ سمجھتے تھے۔

اب اُن کی شاعری سے کچھ مثالیں:-

اسیں عاجز وچ کوٹ علم دے
اوسے آندے وچ قلم دے
بن کلمے دے ناہیں کم دے
باجھوں کلمے پار نہیں

ترجمہ: ہم علم کے شہر میں عاجز ہیں
اُسی نے ہمیں تخلیق کیا
بن کلمے ہم کسی کام کے نہیں
نہ ہی کلمے کے بغیر پار اُتر سکتے ہیں

بلّھے شاہ کلمے کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہیں یعنی خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اُس کے رسول ہیں۔ اس سے توحید پر اُن کے اعتقاد کا اظہار ہوتا ہے۔خدا کی توحید کو بیان کرتے ہوئے ایک اور کافی میں کہتے ہیں۔

اک الف پڑھو چھٹکارا ہے۔
اک الفوں دو تن چار ہوئے

پھر لکھ کروڑ ہزار ہوئے

پھر اوتھوں باجھ شمار ہوئے

ہک الف دا نکتہ نیارا ہے

اک الف پڑھو چھٹکارا ہے

ترجمہ: خدا کے وجود کو سمجھنے کے لیے بے شمار علم اور کتابوں کی ضرورت نہیں۔ محض اک 'الف' کا علم حاصل کرنے سے تمام حقائق سمجھ میں آ جاتے ہیں۔

ایک الف سے دو تین اور چار وجود بنے

پھر اس سے لاکھ کروڑ اور ہزاروں بنے

پھر اُس سے ان گنت وجود بن گئے

ایک الف کا نکتہ نرالا ہے

انسان ایک الف کو پڑھ کر ہر مسئلے سے چھوٹ جاتا ہے۔ بلّھے شاہ نے اپنی کافی میں جس طرح مسئلہ توحید کو بیان کیا اتنے سادہ الفاظ میں مسئلہ توحید وہی بیان کر سکتے ہیں۔

پھر کہتے ہیں:

ع غ دی ہکا صورت، نقطے شور مچایا ہے۔ یعنی تمام خدا اور اس کی تخلیقات میں، خالق و مخلوق میں کوئی فرق نہیں صرف ع کے اوپر ایک نقطہ ہے۔ یعنی تخلیقات اس کے وجود پر ایک نقطے کی طرح ہیں۔ ظاہر ہے کہ حرفِ غ پر جو نقطہ ہے وہ اس کے وجود سے علیحدہ دکھائی دیتا ہے۔

اسی طرح وہ کہتے ہیں

احد احمد وچ فرق نہ بُکھیا۔ اک رتی بھیت مروڑی دا

خدا اور انسان میں احد اور احمد میں صرف ایک میم کی مروڑی کا فرق ہے اور یہی سارا بھید ہے

ایک اور کافی میں وہ دنیا کو ایک صورت کا چکارا کہتے ہیں ۔ یہ خیال بھی وحدت الشہود ہی کو بیان کرتا ہے۔ مندرجہ ذیل کافی میں وہ خدا کو کہتے ہیں کہ تو ہم سے اپنے آپ کو کیوں چھپاتا ہے۔ ہمیں اس دُنیا کے گورکھ دھندے میں ڈال رکھا ہے۔ خود پردے میں بیٹھے ہو اور ہمیں دیدار کے لیے ترسا رہے ہو۔ مگر اس کے بعد وہ اپنی اس کیفیت کا اظہار یوں کرتے ہیں۔ جس میں فنا فی اللہ ہونے کی خواہش کا اظہار ہوتا ہے۔

کیوں او ہلے بہہ بہہ جھاکی دا
ایہہ پردہ کس توراکھی دا
بلھا شاہ تن بھاٹی کر
اگ بال ہڈاں تن ماٹی کر
ایہہ شوق محبت باٹی کر
ایہہ مدھوا اِس بدھ جاکھیدا

ترجمہ: کیوں اوٹ میں بیٹھ کر جھانکتے ہو
یہ پردہ کس سے رکھا ہوا ہے
بلھے شاہ تم اپنے تن کو بھٹی بنا لو
آگ جلا کر ہڈیاں اور تن کو راکھ بنا لو
اس شوق وصال کو عام کرو
شربتِ وصال کو چکھنے کا یہی طریقہ ہے

اُن کی شاعری میں نظریہ ماورائیت یا نظریۂ وحدت الشہود کی مثالیں ہم نے دیکھیں اب کچھ مثالیں ایسی دیکھیں گے جن میں وہ ہر شے کو ایک اکائی کی صورت میں یا نظریہ وحدت الوجود کے تحت دیکھتے ہیں۔

کہیہ کردا نی کہیہ کردانی
کوئی پچھو کھاں دلبر کہیہ کردا
وچ مسیت نماز گزارے۔ بت خانے جاوڑدا
موسیٰ تے فرعون بنا کے دوہو کے کیوں لڑدا

ترجمہ: دیکھو میرا محبوب کیا کرتا ہے
کوئی اس سے پوچھو کہ وہ کیا کر رہا ہے
پہلے مسجد میں نماز پڑھتا ہے پھر بت خانے میں گھس جاتا ہے
موسیٰ اور فرعون کو خود بنا کر پھر دونوں کی شکل میں خود ہی ایک دوسرے سے لڑتا ہے۔

ایک اور کافی دیکھیں۔

ھُن کس تھیں آپ چھپائیدا
بندرا بن میں گئواں چراوے
لنکا چڑھ کے نادو جاوے
مکے دا بن حاجی آوے
واہوا رنگ وٹائیدا

ترجمہ: اب کس سے اپنا آپ چھپاتے ہو
بندرا بن میں گائیں چرا کے
لنکا میں جاکر ناد بجا کر
مکے جا کر حاجی بن کر
خوب رنگ بدل بدل کے ظاہر ہوتے ہو

یہاں ایک کافی پیش کی جا رہی ہے جس میں وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے نظریوں کو پیش کر کے اپنی دانش کی کم مائیگی کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

جے میں تینوں اندر ڈھونڈاں تے پھیر مقید جاناں
جے میں تینوں باہر ڈھونڈاں تے اندر کون سماناں
سبھ کُجھ توں ایں سبھ وچ توں ایں سبھ توں پاک پچھاناں
میں وی توں ہیں، تو وی میں ہیں بلّھا کون نماناں

ترجمہ: اگر میں تجھے اپنے اندر ڈھونڈوں تو مقید تصور ہو گا
اگر باہر ڈھونڈوں تے پھراندر کون ہے
تو ہی سبھ کُجھ ہے، تو ہی سبھ میں ہے اور سبھ سے علیحدہ بھی تو ہے
میں بھی تو ہے، تو بھی میں ہوں، بلّھا بیچارا بے حقیقت ہے

دنیا میں تخلیقات کو زمروں میں تقسیم کر کے انہیں مقید کر دیا جاتا ہے۔ جن سے اُن کے معنی

محدود ہو جاتے ہیں وہ کہتے ہیں

میں بے قید میں بے قید
نہ روگی نہ وید
نہ میں مومن نہ میں کافر
نہ صیدی نہ صید
چودھیں طبقیں سیر اساڈا
کتے نہ ہوئے قید

ترجمہ: میں قید نہیں ہوں، میں قید نہیں ہوں
نہ میں بیمار ہوں نہ حکیم
نہ میں مومن ہوں نہ کافر
نہ میں شکار ہوں نہ شکاری
ہم تو چودہ طبقوں کی سیر کرتے ہیں
اور خودکو محدود نہیں پاتے

اور

بلھا کیہ جاناں میں کون
نہ میں بھیت مذہب دا پایا
نہ میں آدم حوا جایا
نہ میں اپنا نام دھرایا
نہ وچ بیٹھن نہ وچ بھون

ترجمہ: بلھا کیا جانوں میں کون ہوں
نہ میں نے مذہب کا بھید پایا
نہ میں آدم اور حوا کی اولاد ہوں
نہ میرا کوئی نام ہے
نہ میں بیٹھا ہوا ہوں نہ چل رہا ہوں

بلھے شاہ ہر قید سے آزادی سے مراد یہ لیتے ہیں کہ مذہب کے ٹھیکے داروں نے ہمیں جو مذہب کا مطلب بتایا ہے ہم اُسے نہیں جانتے اور نہ ہی ہم اُن کے سکھائے ہوئے علم کو کسی قابل سمجھتے ہیں۔ وہ علمی عصبیت اور پہلے سے قائم کردہ نتائج کو اپنے علم کی بنیاد بنانے کے خلاف تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے تمام موجود امکانات کو رد کر دیا اور کہنے لگے کہ وہ ان تمام درجہ بندیوں کو نہیں مانتے کہ کیا گیا ہے۔ وہ خود ان تمام قیود سے آزاد ہو کر اشیاء کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہتے تھے۔ عالموں اور تجزیہ کاروں کی بتائی ہوئی روش انکو قبول نہ تھی۔ خواہ وہ مذہبی علم ہو یا دیگر دنیاوی علم۔ وہ کسی کو اس بات کی اجازت دینے کو تیار نہ تھے کہ وہ اُنہیں بتائے کہ وہ کون ہیں اور اُنہیں کیا کرنا چاہیے۔

اختتامیہ

خدا کی دو صفات ماورائیت اور مظہریت ہیں۔ اگرچہ دونوں نظریات کے حامیوں میں خاصے اختلافات موجود رہے ہیں مگر دیکھا جائے تو دونوں میں کوئی اختلاف نہیں اور یہ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ فلسفیانہ مباحثوں اور ان میں استعمال ہونے والی اصطلاحات کے باعث دونوں نظریات میں جو بُعد دکھائی دیتا ہے وہ زبان و بیان کے سانچوں کے باعث ہے۔ ورنہ دونوں میں خدا کی ذات جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ صوفیانہ شاعری میں ماوراء کے ساتھ مل جانے کی جو انتہائی خواہش پائی جاتی ہے۔ یہ اس اندرونی کیفیت سے پیدا ہوتی ہے۔ جس کے باعث انسان خود میں اور ماوراء میں دوری محسوس کرتا ہے۔ اس علیحدگی کو محسوس کر کے وہ ہجر کے درد سے تڑپتا ہے۔ مگر جب یہ سوء فہم دور ہو جاتا ہے تو جدائی کی رات ختم ہونے لگتی ہے اور ہر طرف خدا کی شان دکھائی دینے لگتی ہے۔ جہاں فلسفہ مظہریت یا وحدت الشہود میں تطہیر و تزکیہ کے اصول کار فرما ہیں وہاں وحدت الوجود کے فلسفہ میں اخذ و رانجذاب کے۔ ایک کے پیروکاروں کی نظر اختلاف پر پڑتی ہے اور دوسرے کے ماننے والوں کی نظر مشابہتوں پر، مگر حقیقت یہ ہے کہ ذہن اور روح خود کو تضادات میں ظاہر کرتے ہیں۔ اور پھر خود ہی مل جاتے ہیں۔ جیسے کہ انسانی آزادی کی کیفیت میں ہوتا ہے۔ کیونکہ انسانی جدوجہد کی آخری منزل جسمانی، ذہنی اور روحانی آزادی حاصل کرنا ہے۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے نظریات کے حوالے سے خدا سے وصال کا یہی مطلب ہے۔ یہ دونوں نظریات نہ تو ایک

دوسرے کو ختم کرتے ہیں اور نہ ہی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ابن العربی کی طرح بلّھے شاہ بھی دونوں نظریات کو ایک سمجھتے تھے۔ بلّھے شاہ نے اپنی شاعری میں کھل کر اپنے ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ ہر وقت ایک مستی کی حالت میں رہتے تھے اور بلا جھجک جو محسوس کرتے تھے اسے شعری سانچے میں بیان کر دیتے۔ وہ کسی اور کے بتائے راستے پر چلنے سے انکاری ہیں اورخود اپنے لیئے راستے تلاش کرتے ہیں۔ کتابی علم کے بجائے وہ وجدان کے ذریعے علم حاصل کرنے کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ وہ علم کسی عالم کا تصدیق شدہ نہیں ہوتا۔ نہ ہی وہ کائنات کو کسی تنگ و تاریخ تعصب کے سوراخ سے دیکھتے ہیں۔ بلکہ وہ کئی جہتوں سے حقیقت کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُنہوں نے منصور حلاج کے ساتھ خود کو نسبت دی اسے اپنا بھائی کہا اور اُس کے قتل کا خون بہا مانگا۔

منصور تساں تے آیا ہے
تساں سولی پکڑ چڑھایا ہے
میرا بھائی بابل جایا ہے
دیو خون بہا میرے بھائی دا

فلسفے چونکہ روزمرہ زندگی کے مسائل سے پیدا ہوتے ہیں اس لیے ان فلسفوں کے پس منظر میں موجود معاشرتی حالات کا تجزیہ بھی اُنکو اور اُن کے پیروکاروں کی سوچ کو سمجھنے میں ممد ہو سکتا ہے۔ بلّھے شاہ کا دور سماجی اور سیاسی انتشار کا دور تھا۔ پنجاب میں خصوصاً بہت زیادہ تباہی مچی ہوئی تھی۔ سکھوں اور مسلمانوں میں باہمی جنگیں ہو رہی تھیں۔ بلّھے شاہ کی کوشش تھی کہ مفاہمانہ طریقہ اپنایا جائے۔ اسی کوشش میں سکھوں کے گورو تیغ بہادر (۱۶۲۱-۱۶۷۵) جسے اورنگ زیب نے قتل کروادیا تھا کو اُنہوں نے اپنی کافیوں میں تیغ بہادر غازی کہا ہے۔ وہ ہمیشہ مذہبی تعصب کے خلاف بر سر پیکار رہے۔ اُن کے خیال میں سب انسان برابر تھے ۔نہ کوئی ہندو تھا، نہ کوئی تُرک تھا اور نہ مسلمان اور کافر تھا۔ ایسے ہی حالات میں حکمران اپنے متعصبانہ ذہن کی بدولت، لوگوں کو اپنے ظلم کا نشانہ بناتے ہیں۔ وحدت الشہود کے فلسفے میں ایسی تفریق پیدا کرنے کی گنجائش دکھائی دینے لگتی ہے دوسری طرف جو لوگ امن و آشتی چاہتے ہیں وہ ہر شے میں وحدت کی اکائی اور ہم آہنگی دیکھتے ہیں اور لوگوں کو مل جل کر رہنے کا سبق دیتے ہیں۔ ان دونوں فلسفوں میں فرق صرف دو مختلف زاویوں کا ہے اور دونوں

ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ جیسے کسی تصویر کے ٹکڑے کر کے انہیں پھیلا دیا جائے اور پھر اُن ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک اکائی کی صورت میں دوبارہ صورت دے دی جائے۔

جہاں تک بلّھے شاہ کے مذہب کا تعلق ہے وہ انسان دوستی کے مذہب سے تعلق رکھتے تھے مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ اسلام سے دور تھے۔ خدا سے ان کی محبت پر تو ہم سیر حاصل بحث کر چکے ہیں۔ اُن کی شاعری میں ان کا قرآن مجید، حضرت محمدؐاور کلمہ سے محبت کا اظہار بھی ملتا ہے۔ دراصل وہ مذہب کی ایسی تعبیروں، تفسیروں اور تشریحوں کے خلاف تھے جو نیم پختہ عالموں کی کاوشوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ کیونکہ وہ خود عربی، فارسی اورقرآن و حدیث کے عالم تھے اور یہ سب تعلیمات اُن کی فکر میں رچی بسی تھیں۔ وہ جب ایسے منفی باغیانہ کلمات لکھتے ہیں تو اس وقت وہ تمام علوم کی نفی کر رہے ہوتے ہیں۔ انسان جب اصل آزادی حاصل کر لیتا ہے تو اُسوقت وہ تمام بندشوں اور پہلے سے موجود آراء کو خیر باد کہہ دیتا ہے۔ دراصل بلّھے شاہ اپنی اِسی حاصل کردہ آزادی کا اظہار کرتے ہیں جب اُن پر کسی قسم کی پابندی نہیں اور خود اپنی رائے قائم کرنے کے سلسلے میں آزاد ہیں۔ مگر خدا کا وجود ایک ایسا سچ اور ایک ایسی زندہ حقیقت ہے کہ اُس کے حضور وہ ہر دم سجدہ ریز دکھائی دیتے ہیں اور جو انہیں ہر دم تقویت دیتی رہتی ہے۔ وہ خدا کو پانے کے تمام امکانات کو باری باری آزمانا چاہتے ہیں۔

حوالہ جات

۱- *انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا*، ص۸:۴۰۶۔

2. *Hegel's Philosophy of Right* (Iran: T.M. Knox), Oxford University Press, 1958, p. 279.

۳- سید حسین نصر، *تین مسلمان فیلسوف* (مترجم منور علی خان)، علاقائی ثقافتی ادارہ ایران، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۱۲۶۔

۴- ایضاً،ص ص ۱۲۸-۱۲۹۔

نوٹ: مندرجہ بالا مضمون میں جو کافیوں کے نمونے دیئے گئے ہیں اُن کے لیے دیکھئے بلّھے شاہ کی شاعری کا مجموعہ۔ محمد آصف خان، *آکھیا بلّھے شاہ نے*، پنجابی ادبی بورڈ، لاہور، ۱۹۹۲ء۔